اسلام پر جی ایم سیّد کے اعتراضات

جناب پروفیسر سیّد محمد سلیم صاحب

(۲)

ختنہ یہ دراصل ملّی لحاظ سے سنّتِ ابراہیمی ہے۔ فی نفسہ اس کی حکمتیں اور فوائد اتنے واضح ہیں کہ اب غیر مُسلم معاشرے بلکہ بعض ملحد ڈاکٹر تک بھی اس کے قائل ہیں کہ ختنہ کرانے سے کئی قسم کی بیماریوں سے تحفّظ مل جاتا ہے۔ بصورتِ دیگر زائد جھلّی (جسے ختنہ کے عمل سے الگ کر دیتے ہیں) کے نیچے میل یا جراثیم جمع ہو کر درد و سوزش کے علاوہ بعض ایسی تکالیف کا باعث بنتے ہیں کہ جو آسانی سے علاج پذیر نہیں ہوتیں۔

بہتر رہے گا کہ اس مسئلے پر طب و صحت کا کچھ اہم لٹریچر معترضین پڑھ لیں۔

ختنہ کا طریقہ مسلمانوں کے لیے جن وجوہ سے ایک نعمت ہے۔ ان حکمتوں کی طرف ڈاکٹروں کی نظر بھی نہیں گئی ہے اور نہ ان کو یہاں تفصیل سے بیان کرنا ممکن ہے۔ اسلامی شریعت نے اس کو ۱۴ سو سال قبل رائج کر دیا۔ حالانکہ اس وقت تو کیا آج بھی بہت سے لوگوں کو تفصیل سے اس کی حکمتیں معلوم نہیں ہیں۔

خلفائے راشدین خلفائے راشدین کا طرزِ حکومت اور ذاتی کردار ایک مثالی طرزِ عمل تھا۔ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ دوسرے لوگوں کو بھی اس دَور کا معیاری اور مثالی ہونا تسلیم ہے۔ ۱۹۳۷ء میں پہلی مرتبہ ہندوستان میں کانگریس نے قومی حکومتیں قائم کیں۔ سات صوبوں کے اندر۔ اس موقع پر گاندھی نے اپنے وزرا کے نام کھلا خط شائع کیا تھا۔ اس میں لکھا تھا:

"ہمارا مقصد عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے سے حصولِ اقتدار یا حصولِ دولت

نہیں ہے بلکہ رام راجیہ (خدا کی بادشاہت) قائم کرنا ہے۔ رام راجیہ کے قیام کے لیے ہمیں اشوکا یا دکرما جیت کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے۔ بلکہ ابوبکرؓ اور عمرؓ کی طرف دیکھنا چاہیے۔ اور ان کی پیروی کرنا چاہیے۔ کیونکہ تاریخ عالم میں میرے نزدیک ان کے عہد خلافت سے بہتر رام راجیہ کا نمونہ نہیں ملتا" (اخبار برہمن۔ اگست ۱۹۳۷ء)

ستم ظریفی دیکھیے گاندھی ایک ہندو، غیر مسلم۔ تو خلافت راشدہ کو ساری دنیا میں بہترین طرز حکومت قرار دیتا ہے اور اولادِ رسول سید غلام مرتضیٰ شاہ اس کو استحصالی دور قرار دیتا ہے۔

اسلامی حکومت | جی ایم سید کی تیز نگاہوں کو خلافت میں تو سامراج نظر آگیا۔ مگر ان کے ممدوح روس کا سامراج نظر نہیں آتا۔ حالانکہ روس کی کمیونسٹ حکومت نے:

— سات صدیوں سے آباد ترک اور تاتاری اقوام کو کریمیا کی سرزمین سے اکھاڑ کر سائبیریا کے برفستانوں میں پھینک دیا (۱۹۴۵ء) اور وہ وہاں ٹھٹھر کر مر رہے ہیں۔ صرف اس لیے کہ یورپ کی سرزمین میں مسلمان آباد نہ تھے۔ واضح رہے کہ کریمیا بحرِ اسود کے کنارے واقع ہے۔

— اس نے پولینڈ میں اور چیکوسلواکیہ میں کیا کیا؟ کیا یہ سامراج نہیں ہے؟

— اور اب افغانستان میں کیا کر رہا ہے۔ کیا یہ سامراج نہیں ہے؟

— ابھی اگلے ماہ چین سے اس نے ایک معاہدہ کیا ہے۔ جس کے تحت وہ بیرونی منگولیہ کا قبضہ چھوڑ دے گا۔

گویا اب تک چین کے علاقے پر غاصبانہ قبضہ تھا۔ ورنہ چھوڑنے کے کیا معنی۔ کیا یہ سامراج نہیں ہے؟ خلافتِ راشدہ کا تو وہ دور تھا کہ جب کسی مجبوری سے خالد بن ولید کو شہر حمص کو چھوڑنا پڑا تو انہوں نے عیسائیوں اور یہودیوں سے لیا ہوا جزیہ ان کو واپس کر دیا کہ اب ہم آپ کا تحفظ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ یہ تھا ان کا عدل۔ نہاوند کی جنگ میں ایک غلام مسلمان نے اہلِ شہر کو امان دے دی۔ کمانڈر نے اور خلیفہ نے اس کو برقرار رکھا کہ ایک مسلمان کا وعدہ ہم سب کا وعدہ ہے۔ ان کو امان مل گئی۔ یہ تھا وعدے کا ایفا۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم

محمد بن قاسم | راجہ داہر نے اوّل تو ایسی حرکت کا ارتکاب کیا جو تمام مذاہب میں اور تمام معقول

انسانوں کے نزدیک قبیح ترین گناہ ہے۔ اس نے اپنی بہن سے نکاح کیا۔ اس سے وہ بدنام ہوا۔ دوم یہ کہ سندھ کی تمام آبادی بدھ مت کی پیروکار تھی۔ راجہ داہر باہر سے آکر ان پر مسلط ہوگیا۔ اور اپنا ہندو مت ان پر بزور مسلط کر دیا۔ ان وجوہ کی بنا پر یہاں کی آبادی اس سے راضی نہ تھی۔ اسی وجہ سے آبادی نے عربوں کا استقبال کیا تھا۔ سندھیوں کی رائے محمد بن قاسم کے متعلق کیا تھی؟ اس کا اندازہ ان کی بے پناہ محبت سے ہوتا ہے۔ جب ان کو اطلاع ملی کہ اس کو شہید کر دیا گیا ہے تو انہوں نے من کھیڑہ کے مندر میں اس کا بت بنا کر رکھا۔ سو سال بعد کے مؤرخ بلاذری کے الفاظ یہ ہیں: صَوَّرُوْہُ بِالکِیرج (کھیڑہ میں اس کا بت بنایا) شادی بیاہ کے تعلقات پر اعتراض کا کیا مطلب ہے۔ کیا عرب اور سندھی گھل مل کر ایک قوم نہ بنتے؟ کیا عرب بھی سندھیوں کو اچھوت بنا کر رکھتے؟ جس طرح ہندوؤں نے دراوڑوں کو اچھوت بنا کر رکھا ہے۔

مذہب خوف کی پیداوار جی ایم سید بار بار اس رائے کا اظہار کرتا ہے کہ مذہب انسان کے جذبہ خوف کی پیداوار ہے۔ دراصل انیسویں صدی کے ماہرین نسلیات (ANTHROPOLOGY) کا اس زمانہ میں یہی خیال تھا، مگر بیسویں صدی کے آغاز ہی میں یہ بات غلط ثابت ہوگئی۔ مشہور پروفیسر شمٹ لکھتا ہے:

> "اب یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ انسان کے ابتدائی عمران (SOCIETY) کی اعلیٰ ترین ہستی فی الحقیقت توحیدی اعتقاد کا خدائے واحد تھا۔"

THE ORIGIN AND GROWTH OF RELIGON — BY

PROF W SCHIMIDI — 19

دوسرا جرمن محقق (RALF BARON EHREUFEL) لکھتا ہے:

> "ثقافتی تاریخ انسانی کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ انسانی معاشرہ کا پہلا مذہب توحید ہی تھا۔ اور قدیم ترین قبائل جن کا مادی اثاثہ حد درجہ قلیل ہے۔ ان کا اخلاقی معیار بہت بلند ہے۔"

ISLAMIC CULTURE — HYDER ABAD DECCAN 1944

P - 446

اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ انسان اوّل موحد تھا اور با اخلاق تھا۔ بداخلاقی اور وحشت بعد میں داخل ہوئی ہے۔ یہی کچھ قرآن مجید کہتا ہے:

"ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے (پھر یہ حالت برقرار نہ رہی) ان کے اندر اختلافات پیدا ہوئے (بداخلاقی آئی) تب اللہ تعالیٰ نے (ہدایت کے لیے) نبیوں کو بھیجا۔ (بقرہ - ۲۱۲)

قیامت اور آخرت

انیسویں صدی میں سائنس دان قیامت اور آخرت کے منکر تھے۔ وہ دعویٰ کرتے تھے کہ مادہ فنا نہیں ہوتا ہے۔ صرف شکلیں بدلتا رہتا ہے۔ اس زمانہ میں دنیا کے فنا ہونے پر یقین نہیں تھا۔ اب بیسویں صدی میں مادہ ٹوٹ گیا، فنا ہو گیا۔ ادھر ریاضی کی ایک شاخ حرارتی حرکیات (THERMO DYNAMICS) کے قانون نمبر ۲ کے تحت اب یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ سورج کی گرمی بتدریج کم ہو رہی ہے۔ ضرور ایک دن آئے گا جب یہ بے نور ہو جائے گا۔ یہی بات قرآن مجید کہتا ہے کہ اس دن ستارے بے نور ہو جائیں گے۔ اس لیے اب قیامت کا آنا سائنسدانوں کے نزدیک بھی یقینی ہے۔

اب ذرا اس حقیقت کی طرف غور کریں کہ دنیا میں دو قسم کے افراد پائے جاتے ہیں۔ ایک چنگیز خان ہلاکو خان، ہٹلر اور مسولینی جیسے لوگ جنہوں نے ظلم اور غارت گری کا ریکارڈ قائم کر دیا۔ دوسری جانب سقراط، بدھ اور حضرت عیسیٰ اور دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام جنہوں نے حق و انصاف اور نیکی اور خیر کی اشاعت کی۔ اب اگر سب مر کر مٹی میں مٹی بن جاتے ہیں تو درحقیقت نیک لوگ اور بدکردار لوگ سب برابر ہو گئے۔ نیکی اور بدی سب برابر ہو گئی۔ عقلِ سلیم اس بات کو ماننے سے انکار کرتی ہے۔ ضرور ایک دن ایسا آنا چاہیے جب نیکوں کو نیکی کا اجر ملے اور بدوں کو بدی کی سزا ملے۔ بس یہی آخرت ہے۔

عقل پرستی

ہر مردِ معقول تسلیم کرے گا کہ انسانی عقل ترقی کرتی رہتی ہے۔ ریاضی کے جس مسئلہ کو ارشمیدس نے بڑی محنت سے دریافت کیا تھا وہ آج کل نویں دسویں کے لڑکے پڑھتے ہیں۔ پھر ایک ہی زمانہ میں تمام انسانوں کی عقلیں یکساں نہیں ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی سابق وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی نے آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت پر اردو میں ایک کتاب لکھی تھی۔ وہ ۱۹۳۸ء میں انجمن ترقی اردو نے شائع کی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ مسئلہ اضافیت کے سمجھنے والے ساری دنیا میں آٹھ افراد ہیں یعنی اربوں کی آبادی

میں صرف آٹھ افراد سمجھنے والے ہیں۔ حالانکہ یہی وہ مسئلہ ہے جس کی بنا پر انسان چاند پر پہنچا اور ستاروں پہ پہنچ رہا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اگر کسی بات کو نہ صرف چند افراد بلکہ لاکھوں کروڑوں افراد بھی نہیں جانتے اور نہیں سمجھ سکتے۔ تب بھی وہ بات صحیح ہو سکتی ہے۔ صرف شرط یہ ہے کہ بتانے والا استاد معتبر اور مستند ہو۔ عالمِ آخرت اور جنت دوزخ کے امور انسانی عقل سے ماوریٰ ہیں۔ انسان کے پاس ان کو سمجھنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ پانچ صدی قبل ابن خلدون نے اس بات کو خوب سمجھایا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر کوئی سنار اپنے کانٹے سے پہاڑ تولنے کی کوشش کرے گا تو ناکام ہوگا۔ اسی طرح عقائد متعلق آخرت بھی عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔ مغربی فلسفی کانٹ کہتا ہے عقلِ انسانی مادی الاصل ہے یعنی اس پر اس کی بنیاد ہے وہ عالمِ بسیط کے حقائق کی کنہ دریافت کرنے میں قطعاً ناکام ہے۔

یہ مذہبی حقائق ضرور عقل کی دسترس سے ماوریٰ ہیں، مگر خلافِ عقل ہرگز نہیں ہیں۔ دنیا کا سب سے بڑا سائنسدان آئن سٹائن کہتا ہے:

"یہ اقدار (مذہبی احکام) تجربات کے بعد وضع نہیں کیے گئے ہیں، بلکہ یہ برگزیدہ ہستیوں (انبیاء کرام) کی وساطت سے بذریعہ وحی و الہام موصول ہوئے ہیں۔ ان کی بنیاد عقلِ انسانی پر نہیں ہے۔ تاہم یہ تجربہ کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ صداقت کہتے ہی اسے ہیں جو تجربہ سے راست ثابت ہو۔"

OUT OF WAY LATER DAYS— EINE STAIN NEW YARK

مذہب کو ترک کر کے اہلِ مغرب نے کیا پایا اور کیا کھویا۔ ذرا ان کے اہلِ علم سے دریافت کیجیے۔ مشہور امریکی نقاد والٹر لپ مین لکھتا ہے:

"تنہا اپنی ذات پر پہلے کبھی ہم نے اتنا انحصار نہ کیا تھا۔ آج کوئی ہمدرد ہماری فکر کرنے والا نہیں ہے۔ کوئی نمونۂ زندگی بلا چوں و چرا اطاعت کرنے کے لیے اور پیروی کرنے کے لیے ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ کوئی مافوق شارع ہمارے اندر موجود نہیں ہے سب عوام الناس ہیں۔ جن کو دلگداز مصائب او مشکلات کا سامنا ہے۔ تمام کمزوریاں سطح پر نمایاں ہو گئی ہیں۔ نا قابو یافتہ طبعی قوتیں کبھی خوفزدہ کرتی ہیں اور کبھی ڈھارس بندھاتی ہیں۔ فی الحقیقت ہماری ثقافت گنجلک ہے۔ ہماری تہذیبی افزا روقتی اور ہنگامی ہیں۔ ہمارے

جذبات جامے سے باہر ہو رہے ہیں۔ شاید ہی کسی ملاح نے کبھی ایسے ناآشنا سمندر میں جہاز رانی کی ہو، جیسا کہ بیسویں صدی میں پیدا ہونے والے انسان کو کرنا پڑ رہی ہے۔ ہمارے اسلاف سمجھتے تھے کہ وہ اپنا زندگی کا راستہ پیدائش سے لے کر موت تک جانتے ہیں لیکن ہم پریشان ہیں کہ ہمیں کل کے بعد آنے والے دن کی بھی خبر نہیں۔

مذہب سے آزادی حاصل کرنے کے بعد یہ تمام مصیبتیں شروع ہوئی ہیں۔ مذہب سے آزادی ایک دل خراش چیلنج ہے۔ یہ انسانوں کو رہبر کی رہبری سے اور پادری کی طمانیت سے محروم کر دیتا ہے۔ مذہب کے بت کو پاش پاش کرنے والوں نے ہمیں آزاد نہیں کیا، بلکہ درحقیقت سمندر کی بے رحم موجوں میں پھینک دیا ہے۔ اب ہم خود ہی ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔

DRIFT AND MYSTERY — BY WALTER LIPPMAN — P. 196-197 — NEW YARK

قومیت اور وطنیت وطنیت بھی اہلِ مغرب کا تحفہ ہے۔ پہلے تو انسانوں کو جوڑنے کے لیے مذہب کا کلمہ جامع ہوتا تھا۔ وحدتِ الٰہ کا نتیجہ وحدتِ آدم اور وحدتِ عالم کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ لیکن جب اہلِ مغرب نے مذہب ترک کر دیا اور مسلک لادینیت اختیار کر لیا۔ تو انسانوں کو مجتمع کرنے کے لیے وطن کے کلمہ مشترکہ کو استعمال کیا۔ بتدریج قومیت اور وطنیت نے ایک مذہب کی شکل اختیار کر لی۔ قوم پرستی کے تصور کو عام کرنے میں جرمنی میں نکٹے (۱۸۱۴ - ۱۸۶۲) اور ٹریشکے (۱۸۳۴ - ۱۸۹۶) نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اطالیہ میں مازنی (۱۸۰۵ - ۱۸۷۲) نے اہم کردار ادا کیا۔ مازنی نے تو قوم کو مظہرِ الٰہ اور ایک معبود بنا کر پیش کیا۔ سادہ لوح اولادِ آدم اس بت کے بھی پجاری بن گئے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ایشیا اور افریقہ کے ملکوں میں بھی قومیت پھیل گئی۔

مگر سوال یہ ہے کہ قومیت سے مسائل حل ہو جائیں گے۔ کیا غیر ہی ظلم کرتے ہیں اپنے ظلم نہیں کرتے؟ کیا اپنے لوگ فرشتے ہوتے ہیں؟ کیا اپنی حکومت میں نیکیاں آسمان سے برستی ہیں؟ جس کسی کو اپنوں کے مظالم دیکھنے ہوں وہ ہٹلر کی جرمنی اور مسولینی کی اطالیہ کا حال پڑھے۔ آلڈوس ہکسلے لکھتا ہے:

"یہ نیا مذہب انسانیت کے درمیان فساد اور تفریق پیدا کرنے کا طاقت ور ذریعہ ہے۔ قومیت اخلاق کی تباہی کا سبب اس طرح بنتی ہے کہ اس کی رو سے عالمگیر انسانیت، احترامِ آدمیت خدائے واحد پر اعتقاد، سب باطل ہو جاتے ہیں۔ ان کی بجائے انانیت اور خود غرضی کے تصورات ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ جو تصادم و پیکار اور نفرت و حقارت کو جنم دیتے ہیں۔"

برٹنڈرسل مشہور فلسفی کہتا ہے:

"قومیت نوعِ انسانی کی تباہی کے لیے سب سے بڑی نوست ہے"۔

دُور افتادہ جزیروں کو چھوڑ کر دُنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں صرف ایک ہی نسل آباد ہو اور ایک ہی زبان بولی جاتی ہو۔ ہر جگہ مختلف نسلیں اور مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ خود غرضی سے پھر تفریق در تفریق کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ انگلستان میں ویلش، اسکاچ اور آئرش زبانوں کی تحریکیں چل رہی ہیں۔ فرانس میں پرووِنسل، برلنڈی اور برٹ ٹانی زبانوں کی تحریکیں موجود ہیں ــــ ہندوستان کے ہر صوبہ میں لسانی تحریکیں چل رہی ہیں۔ نیچے ہوئے بنگال میں بھی جھارکھنڈ اور گورکھالینڈ کی تحریکیں چل رہی ہیں۔ سندھ میں بھی لاڑ، مغربی، وچولو اور سرائیکی کی تفریق موجود ہے۔ خود غرضی تو مختلف راستے نکال لیتی ہے۔ اگر ایک شہر کے لوگ سرکاری ملازمتوں میں زیادہ تعداد میں ہوتے ہیں تو دوسرے شہر کے لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟ جب اغراض کی بھی کوئی حد نہیں ہے تو تفریق کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ پھر انتشار ہی پھیلے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ عدل و انصاف، اخوت و ہمدردی، شفقت و مہربانی عالمِ انسانیت کی دائمی اقدار ہیں۔ ان اقدار کو بنیاد بنا کر ہر قوم اور ہر ملک حق و انصاف اور خیر و فلاح کا معاشرہ تشکیل دیا جا سکتا ہے۔ مگر ان اقدار پر صرف وہ لوگ عمل پیرا ہو سکتے ہیں، جن کا یوم آخرت پر پختہ ایمان ہو۔ جو خدا ترس ہوں اور متقی ہوں۔ عمل کرنے کے لیے ایک معیاری نمونہ درکار ہے اور وہ ہے حضور اکرم فخرِ موجودات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور حیاتِ طیبہ۔ بقول سعدی ؎

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہر گز بمنزل نہ خواہد رسید

خدا سے بے نیاز ہو کر انسان خود کو آزاد خود مختار سمجھنے لگتا ہے۔ پھر وہ اس راہ پر چلنے لگتا ہے جس پر چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کے نقوشِ پا ثبت ہیں۔ وہ پھر ہرگز اس پر نہیں چلتا جس پر ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کے نقوش ثبت ہیں۔ اب آپ خود فیصلہ کریں کوئی چنگیز خاں اپنی قوم کے لیے رحمت تھا یا عمر فاروقؓ سارے انسانوں کے لیے رحمت تھا۔